لیے بھی فرائض و واجبات ہیں۔آپ حقوق العباد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔آپ کے نزدیک خاندانی زندگی سے مثبت تعلقات کا نام تصوف ہے۔اگر کوئی اس میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ سے تعلق کی ہوا تک نہیں لگی، خواہ وہ تمام عمر رسمی مجاہدے کرتا رہے۔آپ کی تفسیر سے مترشح ہوتا ہے کہ نوافل اور وظائف میں سر مارنے سے بہتر ہے کہ اللہ کی مخلوق کو ناراض نہ کیا جائے۔آپ نے علم سلوک اور تصوف کو جاہل اور مصنوعی صوفیہ، اہل بدعت کی تلبیس، ہندوؤں کے یوگ اور ویدانت کے اصولوں سے پاک رکھنے پر زور دیا ہے۔[۱۴]

☆☆☆

حواشی و مراجع

۱۔ شاطبی، ابواسحق، الموافقات فی اصول الشریعۃ، المکتبہ التجاریۃ الکبری، ۱۹۷۰ء

۲۔ ذہبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، مکتبہ وھبیۃ، عابدین، مصر، ۱۹۸۵، ۲/ ۴۴

۳۔ کشف المحجوب: ص ۱۲۰

۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۰ئ طبع اول، ۱۱/ ۴۷۴ تا ۴۷۶

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۱۹۱

۶۔ التفسیر والمفسرون، ص ۳۶۸۔۳۶۹

۷۔ التفسیر والمفسرون، بہ حوالہ السلمی، ابوعبدالرحمن محمد بن حسین، حقائق التفسیر، ص ۹

۸۔ عرائس البیان، ج ۱، ص ۱۹۰

۹۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۶۰۶

۱۰۔ احمد شنطاوی، حاشیہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ: ۱/ ۳۳۳، لجنۃ الترجمۃ ۱۹۳۳ء

۱۱۔ التفسیر والمفسرون، ص ۳۳۶

۱۲۔ آلوسی، محمود آفندی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی۔ ۱/ ۷، ۵

۱۳۔ عارفی محمد عبدالحی، ماثر حکیم الامت، ادارۂ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۶ئ، ۱/ ۴۷۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔ ۳۱۳

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری، تحمل و برداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن و حدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۸۵/- روپے

اسلامی ریاست میں ادارۂ احتساب
اہمیت، حدود اور شرائط

مولانا محمد جرجیس کریمی

اسلام میں عدل و انصاف کی جو اہمیت ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں جس اہتمام سے اس کا نفاذ چاہتا ہے، اس کے پیش نظر، ضروری تھا کہ وہ اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کرے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے لیے ذہنی بیداری پیدا کی، عدل و انصاف کو ہر شخص کی ضرورت قرار دیا، انفرادی و اجتماعی ہر سطح پر اس کے نفاذ کی تعلیمات دیں، دوست و دشمن ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف بروئے کار لانے کا حکم دیا۔ مزید برآں اس نے احکام الٰہی کے تحت دین و دنیا کے معاملات کی انجام دہی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائی اور مختلف انسانی طبقات میں عدل و انصاف کے قیام کو اسلامی ریاست کا نصب العین قرار دیا۔

اسلامی معاشرہ میں عدل و انصاف نافذ کرنے والے ادارے

عدل و انصاف کا حصول محض حکم راں کی خواہش یا کوشش سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے کچھ معاون اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو درج ذیل ہے:

۱۔ قضا ۲۔ افتائ ۳۔ شرطہ ۴۔ حسبہ ۵۔ دیوان مظالم

۱۔ قضا: قضا کا مطلب ہے عدلیہ، یعنی قانون کی حکم رانی۔ متمدن معاشرہ، اجتماعی شیرازہ بندی، حقوق کا تحفظ، مظالم کی روک تھام اور عدل و انصاف کا استقرار قانون کی بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ اسلام میں عدل و انصاف کی جو اہمیت ہے اسی کے بہ قدر اہمیت نفاذ قانون اور قیام عدل کے اس ادارے یعنی قضا یا عدالت کو

حاصل ہے۔ اسلام میں کوئی شخص قانون سے بالا تر نہیں ۔ اس لیے قاضی کے اختیارات کا دائرہ رعایا کے تمام طبقات اور حکومت کے جملہ افسران، حتیٰ کہ سربراہ مملکت تک محیط ہے۔ قاضی محض احکام الٰہی کا پابند ہوتا ہے، وہ کسی اور کی پابندی قبول نہیں کرتا۔

۲۔ افتا: اسلام کی تعلیمات کے مطابق اللہ کی ذات اقدس صرف محدود مذہبی معنیٰ میں معبود نہیں بلکہ وسیع تر معنیٰ میں سیاسی اور قانونی اعتبار سے حاکم، مطاع اور واضع قانون بھی ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت کے قوانین کا ماخذ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کو قرار دیا گیا ہے۔ ہر نزاع میں فیصلے کے لیے انہی دونوں ماخذ ومصادر کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے:

> يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَطِيْعُواْ اللّهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِيْ الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيْلا(النسائ:۵۹)
>
> ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں ۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو ۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقۂ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے''

قرآن وحدیث کی طرف رجوع کا یہ عمل استفتاء کہلاتا ہے اور ان مسائل کا شرعی حل پیش کرنا ادارۂ افتاء کا کام ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں عدل وانصاف کے قیام کے لیے قضا کے بعد افتاء کی اہمیت ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے افتاء قضا پر بھی فوقیت رکھتا ہے، کیوں کہ پہلے شریعت کا حکم جاننے کی اہمیت ہے پھر اس پر عمل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عمل کے بارے میں علم نہ ہو تو اسے اہل علم سے جاننے کا حکم دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اہل علم کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو احکام الٰہی سے واقف کرائیں ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبة: ۱۲۲)

"مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے، تاکہ وہ پرہیز کرتے"۔

۳۔ شرطہ: یعنی محکمۂ پولیس۔ انسانی تاریخ میں ہابیل اور قابیل کے عہد سے ظلم وتشدد اور جرائم کے ارتکاب کا آغاز ہو گیا تھا۔ سوسائٹی کے ارتقاء کے ساتھ جرائم اور مظالم میں بھی ترقی اور اضافہ ہوتا گیا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مظالم کو روکنے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے مستقل ایک ادارے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں منظم یا غیر منظم پولیس کا وجود رہا ہے، جو سماج کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آج کی موجودہ تنظیمی ہیئت میں موجود ہے۔

اسلامی ریاست میں ایک منظم اجتماعی ادارے کے اعتبار سے شرطہ کا قیام عہد فاروقی کی یادگار ہے۔ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں پولیس کا باقاعدہ ادارہ موجود نہیں تھا۔ مختلف ذرائع سے اس کی ضرورت کی تکمیل ہوتی تھی۔ عہد فاروقی میں کثرت فتوحات اور وسعت تمدن کے باعث امن و مان کے استقرار کا مسئلہ اہم ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ادارہ شرطہ کی تشکیل کی، پھر حضرت عثمانؓ نے صاحب شرطہ کا منصب جاری کیا۔ بعد میں اسلامی ریاست میں یہ ادارہ اور منظم ہوتا گیا۔

شرطہ یعنی محکمۂ پولیس کے ذمے جو فرائض ہوتے ہیں، انھیں چار حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) انسداد جرائم، یعنی وقوع سے پہلے جرائم کی روک تھام، اس کے لیے پولیس کا گشت اور مشتبہ افراد کی نگرانی شامل ہے۔ (۲) انکشاف جرائم، یعنی وقوع شدہ جرائم کا کھوج اور سراغ لگانا اور مجرموں کی گرفت کرنا۔ (۳) تفتیش جرائم، یعنی وقع شدہ جرائم میں مجرموں کے خلاف ثبوت فراہم کرنا۔ (۴) پیروئ مقدمات،

یعنی مجرموں کو قرار واقعی سزا دلانا۔ یہ چار اہم کام شرطہ کے ذمہ ہیں، جن کی ادائی کے بغیر اسلامی ریاست میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے۔

(۴) حسبہ: یعنی ادارۂ احتساب۔ اس کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ ہر مسلمان امر بالمعروف ونہی اعن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ دوسرے یہ کہ اس فریضہ کی اجنام دہی کے لیے حکومت افراد کو متعین و مامور کرے۔ ادارۂ حسبہ کی اہمیت اسلامی ریاست کے آغاز ہی میں محسوس کر لی گئی تھی۔ چنانچہ عہد رسالت میں رسول اکرم ﷺ بہ ذات خود اس اہم کام کو انجام دیتے تھے۔ چنانچہ آپؐ وقتاً فوقتاً بازار کا چکر لگاتے اور کوئی غلط کام، خاص طور پر خرید وفروخت کے حوالے سے دیکھتے تو اس کی اصلاح فرماتے تھے۔ بعد میں خلفاء راشدین نے بھی اس فریضہ کو انجام دیا اور اس کے لیے بعض افراد کو مقرر فرمایا۔ بعد کے ادوار میں اسلامی ریاست میں ہمیشہ یہ ادارہ کارفرما رہا ہے۔

ادارۂ حسبہ کا دائرہ کار دینی واخلاقی، معاشرتی وتمدنی، اقتصادی ومعاشرتی اور قانونی وعدالتی تمام امور ومسائل تک وسیع ہے۔

(۵) دیوان المظالم: اس سے مراد یہ ہے کہ آپس میں ظلم وتعدی کرنے والے ہر دو فریق کو جبراً عدالت میں پیش کر کے ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ اگر وہ انکار کریں تو انھیں ڈرا دھمکا کر یہ کام کیا جائے۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد جبر و استبداد کا خاتمہ ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب کرنے والے ارباب اقتدار اور عمال حکومت ہوں یا قاضی اور اس کے ماتحت افراد یا عام رعایا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد قانون کی حکم رانی، عدل وانصاف اور ظلم کا استیصال ہے۔ دیوان المظام اور ادارۂ حسبہ کے درمیان دو پہلوؤں سے مشابہت اور دو پہلوؤں سے فرق پایا جاتا ہے:

۱۔ دیوان المظالم ان امور ومعاملات کی سماعت کرتا ہے جن کی انجام دہی سے قاضی عاجز وکم زور ہو، جب کہ ادارۂ حسبہ ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو چھوٹے ہوں اور قاضی کی عدالت میں ان کا پیش کرنا مناسب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ

دیوان مظالم کے ذمے دار کا درجہ قاضی سے برتر ہوتا ہے، جب کہ حسبہ کی حیثیت قاضی سے کم تر اور اس کے تابع ومعاون کی ہوتی ہے۔

۲۔ دیوان مظالم کے سربراہ کو مقدمات کی سماعت اور فیصلے دینے کا پورا اختیار ہوتا ہے، جب کہ محتسب کو ایسا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ دیوان المظالم ایک برتر ادارہ ہونے کی حیثیت سے قاضی اور محتسب دونوں کا نگراں ہوتا ہے۔

ادارۂ احتساب کی اہمیت وضرورت اور اس کے دائرۂ کار پر امام ابن تیمیہؒ نے اپنی معروف کتاب 'الحسبۃ فی الاسلام' میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس مضمون میں اس کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ [راقم کے پیش نظر دار الفکر بیروت کا شائع شدہ نسخہ رہا ہے]

تمام سرکاری مناصب کا مقصد اقامت دین:

امام ابن تیمیہ کے نزدیک سرکاری مناصب امانت ہیں اور امانت کو امانت داروں کے حوالے کرنا واجب ہے۔ اسی طرح مناصب کا بنیادی مقصد اقامت دین ہے۔ ان سے دین قائم کرنے کا کام لیا جائے گا۔ تبھی ان کا صحیح استعمال ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو امانت میں خیانت ہوگی۔ امام موصوف لکھتے ہیں:

أصل ذالک أن تعلم ان جمیع الولایات فی الاسلام مقصودها أن یکون الدین کله وان تکون کلمة الله هی العلیا (الحسبة:۳)

''امام موصوف آگے تحریر فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو پیدا کیا، اسی وجہ سے اس نے کتابیں نازل کیں اور انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا اور اسی بات پر رسول اکرمؐ، صحابہؓ اور مسلمانوں نے کفار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ سے جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات:۵۶)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِکَ مِن رَسُولٍ إِلَّا نُوحِیْ إِلَیْہِ أَنَّہُ لَا إِلَہَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (الانبیائ:۲۵)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں۔ پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو''۔

ایک جگہ اور ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ أُمَّۃٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّٰہَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ (النحل:۳۶)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو''۔

ان تمام آیات میں اللہ کی عبادت کا حوالہ دیا گیا ہے اور اللہ کی عبادت اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔

اجتماع کے بغیر انسانی زندگی قائم نہیں رہ سکتی

امام موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ انسانوں کی مصلحتیں، خواہ وہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی، اجتماع اور باہمی تعاون و تناصر، یعنی ایک دوسرے کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی مخلوق ہے، یعنی وہ سماج بنا کر رہتا ہے، جس میں وہ نفع حاصل کرتا ہے یا ضرر سے بچتا ہے۔ چنانچہ اس اجتماع کو چلانے کے لیے ایک حکم راں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں تمام مذاہب کے ماننے والے، خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا کفار و مشرکین، اس حقیقت کو مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اجتماع کے معاملات اپنے حکم رانوں کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ امام موصوف رقم طرز ہیں:

فجمیع بنی آدم لابدّ لھم من طائفۃ آمرو ناہٍ فمن لم یکن من اھل الکتاب الا لھیۃ و لا من أھل دین فانھم یطیعون ملوکھم فیما یرونانہ یعود لمصالح دنیاھم (الحسبۃ:۴)

''تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے ایسا گروہ جو ان کو حکم دے اور روکے۔

پس جولوگ اہل کتاب میں سے یا آسمانی دین کے ماننے والے نہیں ہیں،
وہ بھی اپنے بادشاہوں کی اطاعت کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے
دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کررہے ہیں''۔

معاشرہ کے قیام کے لیے آمرو ناہی (حکم دینے والا رحکم راں) کی ضرورت ناگزیر ہے۔اسی وجہ سے اسلامی تعلیمات میں حکم رانوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے کم سے کم اجتماعیت میں بھی اطاعت امیر کی تلقین کی گئی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذاخرا ج ثلاثۃفی سفر فلیو مرو اا حدھم (ابو دائود)

'جب تین لوگ سفر پر نکلیں تو ان میں سے ایک کو اپنا امیر بنا لیں'۔

امام ابن تیمیہؒ رقم طراز ہیں کہ جب سب سے چھوٹی جماعت پر واجب ہے کہ امارت قائم کرے تو ظاہر بات ہے کہ بڑی جماعت اور معاشرہ اور پوری امت کے لیے یہ کیوں واجب نہ ہوگا کہ وہ اپنے معاملات طے کرنے کے لیے امارت قائم کرے اور اپنے امیر (خلیفہ رحکم راں) کی اطاعت کرے۔اسلام میں جملہ ولایات، مناصب اور عہدوں کا بنیادی مقصد امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔اس کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور اسی معاملے میں اہلِ ایمان کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔ارشاد ہے:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ (التوبۃ:۲۱)

'مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی
کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'۔

بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا قدرت رکھنے والے پر واجب ہے، بلکہ یہ فرض کفایہ ہے۔اگر کچھ لوگ اس کو انجام نہ دیں تو فرض عین ہو جاتا ہے۔قدرت سے مراد حکومتی اختیارات ہیں، کیوں کہ اختیارات رکھنے والا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔

حکم راں پر واجب ہے کہ وہ حکومتی معاملات صاحب صدق و عدل کے ذریعہ طے کرے۔ اگر ایسا شخص نہ ملے جو ہر اعتبار سے معیاری ہو تو لوگوں میں جو اس کا زیادہ اہل ہو، اس سے کام لے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ''جس نے کسی شخص کو کوئی منصب دیا، حالاں کہ وہ جانتا تھا کہ اس عہدے کے لیے اس سے زیادہ اہل شخص موجود ہے تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی''۔ اگر مطلوبہ اہمیت کا حامل شخص موجود نہیں ہے تو درجہ بہ درجہ لوگوں سے خدمات حاصل کی جائیں گی۔ چنانچہ حسبہ کی ذمہ داریوں کی ادائی کے لیے بھی ضروری ہے کہ حاکم وقت، صاحب صدق و عدل کا تقرر کرے۔

محتسب کی ذمہ داریاں

ادارۂ حسبہ کے ذمہ جو کام ہیں ان میں اولین کام دینی امور کی انجام دہی کی تلقین کرنا ہے، مثلاً عوام الناس کو پنج وقتہ نمازوں کی تاکید کرنا، جو اس میں کوتاہی کرے اس کی گرفت کرنا، شرعی حدود کی خلاف ورزی کرنے والے کو پابند بنانا وغیرہ۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نماز کی اولین اہمیت ہے۔ اس لیے کہ وہ دین کی بنیادوں میں سے ہے۔ نماز ایمان کے زبانی اقرار کا عملی ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معراج میں بغیر کسی واسطہ کے براہِ راست نبی کو خطاب کرکے اسے فرض قرار دیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مرض الموت میں اس کی پابندی کی خصوصی وصیت فرمائی ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ خلفاء راشدین اپنے گورنروں کو نماز کی پابندی کرانے کی خصوصی تاکید فرماتے تھے۔

محتسب لوگوں کی جماعت اور جمعہ، سچ بولنے، امانت ادا کرنے کا بھی حکم دے گا اور منکرات، جھوٹ، خیانت، تجارت میں بدعنوانی، دھوکہ دھڑی، ملاوٹ سے روکے گا۔ خرید و فروخت میں دھوکہ دہی کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ قابل فروخت چیزوں کے عیوب کو چھپایا جائے، اسی طرح کھانے والی چیزوں میں ملاوٹ کی جائے، دیگر مصنوعات مثلاً کپڑوں، عطریات، سونے چاندی یا ہیرے و جواہرات میں ملاوٹ کی

جائے ، یا نقلی اور جعلی چیزوں کو اصلی بتا کر فروخت کیا جائے ۔منکرات کے مفہوم میں خرید و فروخت کے وہ معاملات شامل ہیں جو حرام کردہ ہیں، جیسے سود، جوا وغیرہ۔ محتسب خرید و فروخت کے ان تمام طریقوں پر نکیر کرے گا جو شریعت میں حرام اور ناجائز قرار دیے گئے ہیں۔

محتسب لوگوں کو ذخیرہ اندوزی سے بھی روکے گا اور انھیں مجبور کرے گا کہ وہ معروف قیمت پر اپنی اشیاء فروخت کریں، حتیٰ کہ اگر کہیں اضطرار کی کیفیت ہو تو صاحب مال کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ ثمن مثل (یعنی موجودہ قیمت) پر فروخت کرے ۔اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے متعین قیمت پر فروخت نہ کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا۔

محتسب لوگوں کو مختلف پیشے اختیا کرنے کی بھی تلقین وتا کید کرے گا، کیوں کہ انسان فطری طور پر مختلف چیزوں کا محتاج ہوتا ہے، جیسے زراعت، کپڑوں کی بنائی، سلائی اور مکانوں کی تعمیر وغیرہ۔ ان چیزوں کی ضرورت ہر انسان کو پڑتی ہے اور یہ سارے کام تن تنہا کوئی فرد انجام نہیں دے سکتا، لہٰذا لوگوں کو یہ کام مل جل کر کرنا چاہیے۔ یہ تمام پیشے فرض کفایہ کے درجے میں ہیں ۔اگر کچھ لوگ ان کو انجام نہ دیں تو وہ فرض عین ہو سکتے ہیں ۔اس لیے محتسب لوگوں کو ان پیشوں کو اختیار کرنے کا حکم دے گا۔ اگر وہ آمادہ نہ ہوں تو انھیں مجبور کیا جائے گا۔ اس صورت میں ان کو معروف طریقے سے اجرت دی جائے گی یا پھر متعین قیمت پر تاجرانہ طریقے سے انھیں استعمال کرے گا۔

اشیاء کی قیمتوں کی تعیین کے سلسلے میں علماء کی دو رائیں ہیں: ایک رائے کے مطابق قیمتیں متعین نہیں کی جاسکتیں، جب کہ دوسری رائے کے مطابق ان کی تعیین کی جائے گی ۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے جو حلال تو ہو، مگر اس کی قیمت معلوم نہ ہو۔ جب تک کسی سامان کو فروخت کرنے والا اس کی قیمت نہ بتا دے اور خریدنے والا اس کی قیمت نہ جان لے ، اس وقت تک اس کی خرید وفروخت جائز نہیں۔

محتسب دینی امور میں بدعات کی ترویج و اشاعت اور تدلیس کے طریقوں

کی روک تھام کرے گا۔ مثلاً صحابہ کرامؓ کو سب وشتم کرنا، ائمہ وفقہاء کو برے الفاظ سے پکارنا، حکم رانوں کو نازیبا کلمات سے یاد کرنا، حدیث کا انکار کرنا، موضوع احادیث کو رواج دینا، دینی امور میں غلو کا اظہار کرنا، تقدیر کا انکار کرنا یا جادو ٹونا اور شعبدہ بازی میں مصروف ہونا وغیرہ۔ محتسب ان معاملات میں روک ٹوک کرے گا، یہاں تک کہ متعلق فرد توبہ پر آمادہ ہو جائے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کی تعزیر کی جائے گی۔ سزا اسی وقت نافذ ہوگی جب جرم ثابت ہو جائے، لیکن روک ٹوک جرم ثابت ہوئے بغیر محض شبہ کی بنیاد پر بھی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جو شخص جھوٹ بولنے میں مشہور ہو اس کی گواہی قبول کرنے میں احتیاط کی جائے گی۔ (الحسبۃ: ص ۲۹)

امام موصوف محتسب کی ان ذمہ داریوں کی وضاحت کے بعد لکھتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تقاضے شرعی سزاؤں کے نفاذ کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (الحسبۃ: ص ۳۰)

'اللہ تعالیٰ حکومت کے ذریعہ ان چیزوں کی اصلاح کرتا ہے جن کی اصلاح قرآن کے ذریعہ نہیں ہو پاتی'۔

چنانچہ حدود وتعزیرات کو قائم کرنا ارباب حل وعقد کے اوپر واجب ہے۔ یہ سزائیں واجبات کے ترک اور محرمات کے ارتکاب پر دی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، جیسے چوری اور قذف کی سزا اور کچھ غیر مقرر کردہ ہیں، جن کو تعزیر کہا جاتا ہے۔ تعزیر کی مقدار اور نوعیت گناہ اور جرم کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ یہ مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے، جیسے، ڈانٹ، پھٹکار، قید، جلاوطنی، مارنا پیٹنا وغیرہ۔ مارنے کی سزا واجب کے ترک پر دی جائے گی، جیسے ترکِ صلاۃ یا واجب حقوق کی عدم ادائی یا قرض کی عدم ادائی یا مغصوب (غصب شدہ) کی واپسی میں لیت ولعل یا امانت کی ادائی میں کوتاہی وغیرہ۔ کبھی ایک ہی بار مار لگائی جائے گی اور کبھی متعدد بار وقفے وقفے سے، یہاں تک کہ وہ اپنی اصلاح کرلے۔

تعزیر کی کم از کم کوئی حد نہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ حد کے بارے میں فقہاء کی تین آراء ہیں: بعض نے زیادہ سے زیادہ حد دس کوڑے قرار دی ہے۔ بعض کے نزدیک اس میں حدود سے کم یعنی انتالیس (۳۹) یا انیاسی (۸۹) کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ تیسری رائے یہ ہے کہ اس کے لیے پہلے سے طے نہیں کیا جائے گا، بلکہ بروقت اس کا فیصلہ ہوگا کہ مجرم کو کتنے کوڑے مارے جائیں۔ بہ ہر حال ان کی تعداد حد کے برابر یا اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ ایسا شخص جو فساد انگیزی میں مشہور ہو اور اسے قتل کیے بغیر اس کے فساد کو روکا نہ جاسکے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (الحسبۃ: ص ۳۱)

امام موصوف مزید آگے وضاحت فرماتے ہیں کہ مال کے ذریعہ بھی تعزیر کی جا سکتی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے بارے میں وافر دلائل موجود ہیں۔ جن لوگوں نے مال کے ذریعہ تعزیر کے مسئلہ کو منسوخ قرار دیا ہے ان کا موقف کم زور ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مال کے ذریعہ تعزیر کی جاسکتی ہے، جیسا کہ مختلف واقعات اور نصوص سے پتا چلتا ہے۔ مثلاً حدود حرم میں اگر کوئی شخص شکار کرے تو اس کی شکار کردہ چیز سلب کر لی جائے گی۔ اسی طرح شراب کے برتنوں کو توڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مسجد ضرار کو منہدم کرنے کا واقعہ بھی اس کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد دلائل موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کے ذریعہ تعزیر کی جاسکتی ہے۔ امام مالک، امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا یہی مسلک ہے۔ (الحسبۃ: ص ۳۲۔۳۱)

مال کے ذریعہ تعزیر کی ایسی شکلیں ہوں گی، جیسی بدنی سزاؤں میں ہوتی ہیں، مثلاً کبھی سزا جرم کے بدلہ میں ہوتی ہے، جیسے چور کا ہاتھ کاٹ دینا، کبھی آئندہ جرم کے انسداد کی غرض سے سزا دی جاتی ہے، جیسے قصاص۔ ایسے ہی مالی سزا کبھی منکر کے ازالے کے لیے ہوتی ہے، کبھی مال کو تلف کر کے سزا دی جاتی ہے، کبھی اس کی ہیئت تبدیل کر دی جاتی ہے، کبھی ملکیت تبدیل کر دی جاتی ہے، جیسے بتوں، مجسموں اور کھیل کود کے سامان کو تلف کر دینے کا حکم ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو تلف نہ کر کے انھیں صدقہ کر دیا جائے گا، کپڑوں میں بنی جان دار کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے گا کہ وہ جان دار معلوم نہ ہوں

، جہاں تک ملکیت تبدیل کرنے کی بات ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے مسروقہ مال کے بقدر یا اس سے دوگنا مال بطور جرمانہ ادا کرنا، جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے۔ جس شخص نے درخت سے پھل چوری کیا اسے بہ طور سزا کچھ کوڑے مارے جائیں گے اور اسے مسروقہ پھل کے وزن سے دوگنا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ اسی طرح جس شخص نے مویشی رات میں ان کی قیام گاہ پر پہنچنے سے پہلے چوری کیا، اس کو کچھ کوڑے مارے جائیں گے اور مویشی کی قیمت سے دوگنا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ ایسا ہی فیصلہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے منقول ہے اور فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے۔(الحسبۃ: ص۳۶)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت اور شرائط

امام ابن تیمیہؒ نے آگے ایک فصل 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے عنوان سے قائم کی ہے، جس میں انھوں نے قرآن وحدیث کی متعدد نصوص درج کرتے ہوئے اس کی فضیلت واہمیت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے، جس طرح جہاد فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ اسے انجام دیں تو باقی لوگوں سے وہ ساقط ہو جاتا ہے، ورنہ وہ فرض عین ہو جاتا ہے اور اسے ترک کرنے کی وجہ سے سارے لوگ گناہ گار ہوں گے۔ امام موصوف رقم طراز ہیں:

> **وکذلک الامر بالمعروف والنهی عن المنکر لا یجب علی کل أحد بعینه بل هو علی الکفایة کما دلّ علیه القرآن، ولما کان لجهاد من تمام ذلک کان الجهاد ایضاً کذلک، فاذا لم یقم به من یقوم بواجبه أثم کل قادر بحسب قدرته اذا هو واجب علی کل انسان بحسب قدرته کما قال النبی ﷺ 'من رأی منکم منکراً فلیغّیره بیده، فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک أضعف الایمان**
> (الحسبۃ: ص۴۰۔۴۱)

"ایسے ہی امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر فرد پر واجب نہیں ہے، بلکہ وہ فرض کفایہ ہے، جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، جس طرح جہاد فرض کفایہ

ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تتمہ ہے۔ پس جب اس کو ادا نہ کیا جائے تو اپنی قدرت و استطاعت کے مطابق ہر قادر شخص گناہ گار ہوگا، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ’جو شخص منکر دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روک دے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے اس کو برا جانے اور یہ سب سے کم درجے کا ایمان ہے‘‘۔

بسا اوقات بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم خود راہ راست پر ہیں تو دوسروں کی برائیاں ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لاَ يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُون (المائدۃ:۱۰۵)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گم راہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو‘‘۔

چنانچہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں، حالاں کہ حضرت ابوبکرؓ کے قول کے بموجب ایسے لوگ آیتِ مذکورہ کی غلط تأویل کرتے ہیں، بلکہ جیسا کہ انھوں نے حضور ﷺ سے سنا ہے: ’’لوگ برائی دیکھیں اور اس کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں تو عین ممکن ہے کہ عذاب یکساں طور پر سب کو گھیر لے‘‘۔

اس کے برعکس بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے اور موقع و محل دیکھے ہاتھ اور زبان سے اس کی انجام دہی کو ضروری سمجھتے ہیں، حالاں کہ اس کے لیے مصلحتوں اور موقع و محل دیکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے صلاح کے بہ جائے فساد رونما ہو جائے۔ اسی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے حکم رانوں کے ظلم و جبر پر صبر کی تلقین فرمائی ہے اور ان سے قتال کے خلاف خروج سے منع فرمایا ہے، جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ اہل السنۃ والجماعت کا یہی موقف ہے، جب کہ معتزلہ اور دوسرے فرقے حکم رانوں کے

خلاف خروج کو اصول دین میں سے قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس کی وجہ سے فساد برپا ہوتا ہے، حالاں کہ مفاسد و مصالح اور نیکی و برائی میں مصلحتوں وحکمتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔(الحسبۃ :ص ۴۲۔ ۴۳)

نیکی سے محبت اور برائی سے نفرت کبھی اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہوتی ہے اور کبھی اپنے نفس کے لیے ۔ فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائی کے وقت دیکھنا چاہیے کہ اس کے پیچھے اصل محرک کیا ہے؟ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اتباع ہوئی یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی ہے، جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے ۔ارشادِ ربانی ہے:

یَدَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (ص: ۲۶)

''اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کے تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی''۔

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ 'تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں: نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں: پوشیدہ وعلانیہ اللہ سے ڈرنا، محتاجی اور کشادگی میں میانہ روی اختیار کرنا اور غصہ ورضا میں کلمۂ حق بولنا۔ اور ہلاک کرنے والی چیزیں یہ ہیں: شحِ مطاع (یعنی ایسا بخل جو آدمی سے نہ جائے) ہوی نفس (یعنی نفس کی اندھی پیروی کرنا) اور عجب نفس (یعنی اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھنا)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اعمال صالحہ میں سے ہے اور کوئی عمل صالح بارگاہِ الٰہی میں اس وقت تک مقبول نہیں ہوتا جب تک کہ وہ محض اللہ کی رضا کے لیے نہ ہو اور اسے پورے علم اور بصیرت کے ساتھ انجام نہ دیا جائے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا مشہور قول ہے:

من عبد اللہ بغیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح (الحسبۃ: ص ۴۷)